تصوف اسلامی کا ارتقاء

پروفیسر ضیاء

حضرت شاہ ولی اللہؒ تصوف کے طریقوں میں مختلف زمانوں میں جو بڑے بڑے تغیرات ہوئے اُن کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب "ہمعات" میں فرماتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کے زمانے میں چند نسلوں تک اہل کمال کی بیشتر توجہ زیادہ تر شریعت کے ظاہری اعمال کی طرف رہی۔ ان لوگوں کو باطنی زندگی کے جملہ مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل ہی میں حاصل ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ان بزرگوں کا "احسان"[1] یعنی حاصل تصوف یہ تھا کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے۔ ذکر اور تلاوت کرتے تھے، روزے رکھتے تھے صدقہ اور زکوٰۃ دیتے تھے اور جہاد کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی شخص ایسا نہ ہوتا، جو سر نیچے کئے بحر تفکرات میں غرق نظر آتا۔ یہ بزرگ خدا تعالےٰ سے قرب و حضوری کی نسبت اعمال شریعت اور ذکر و اذکار کے سوا کسی اور ذریعہ سے حاصل کرنے کی سعی نہ کرتے۔ بے شک ان اہل کمال بزرگوں میں جو محقق ہوتے ان کو نماز اور

---

[1] احسان یعنی اللہ کی اس یقین کے ساتھ عبادت کرنا کہ گویا عبادت کرنے والا اسے سامنے دیکھ رہا ہے یا اگر ایسا نہ ہو تو اسے یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحب "ہمعات" میں فرماتے ہیں:۔ دین کے محافظین کا دوسرا گروہ وہ ہے جسے خدا تعالےٰ نے باطن دین کی حفاظت کی، جس کا کہ دوسرا نام "احسان" ہے، استعداد عطا فرمائی ہے۔ زمانے میں اس گروہ کے بزرگ عوام الناس کے مرجع رہے ہیں۔ اطاعت و نیکوکاری کے اعمال سے باطن نفس میں جو اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور دل کو ان سے جو لذت ملتی ہے، یہ بزرگ لوگوں کو ان امور کی دعوت دیتے ہیں۔

ذکر و اذکار میں لذت ملتی۔ قرآن مجید کی تلاوت سے وہ متاثر ہوتے۔ مثلاً وہ زکوٰۃ محض اس لئے نہ دیتے کہ زکوٰۃ دینا خدا کا حکم ہے بلکہ خدا کے حکم کی بجاآوری کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو بخل کے روگ سے بچاتے چنانچہ جب وہ اپنے آپ کو دنیاوی کاموں میں بے حد منہمک پاتے اور انہیں اس کا احساس ہوتا، تو وہ دل کو کاروبار دنیا سے ہٹانے کے لئے زکوٰۃ دیتے۔ اسی طرح شریعت کے دوسرے احکام بجالانے میں بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔

شاہ صاحب کے نزدیک یہ تصوف کا پہلا دور ہے، اور اس میں زیادہ زور ایمان اور عمل پر تھا۔

تصوف جسے اس دور میں "احسان" کا نام دیا جاتا تھا، دین اسلام کا وہ پہلو ہے جس کا زیادہ تر تعلق باطنی زندگی سے ہے۔ اب واقعہ یہ ہے کہ اسلام دین وسط ہے۔ وہ خارجی اور باطنی زندگی میں توازن چاہتا ہے۔ فکر و عمل میں اعتدال قائم کرتا ہے۔ ایمان اور عمل دونوں کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اور پھر اس کا ظہور بھی ایک ایسی سرزمین میں ہوا، جو مشرق اور مغرب کے درمیان واقع تھی اور دونوں کو ملانے والی کڑی تھی۔ ایک طرف اس کا رشتہ ہندوستان اور چین سے تھا۔ دوسری طرف یونان و روم و ایران سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ اور جس قوم نے سب سے پہلے اس دین کو اپنایا، اس کے تصورات کے خاکوں میں رنگ بھرا، وہ عربوں جیسی عملی قوم تھی۔ پھر ان کے بعد جس قوم نے اسلامی علوم و فنون اور ادب و فلسفہ کو ترقی دی، وہ ایرانیوں جیسی ذہین قوم تھی، جس کی طبیعت کا رجحان باطن کی طرف زیادہ تھا۔

"احسان" نے بعد میں اسلامی تاریخ میں تصوف کی جو علمی و عملی شکل اختیار کی، تو ایسا ہونا فطری تھا کیونکہ جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب نے فرمایا ہے، دین محمدی کی دو حیثیتیں ہیں ایک ظاہری اور دوسری باطنی، نیکی و طاعت کے کاموں سے دل پر جو اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں، ان کے احوال و کوائف کی تحصیل دین کی باطنی حیثیت کا مقصود ہے اور یہی تصوف ہے۔ دنیا کے ہر مذہب میں کسی نہ کسی صورت میں تصوف کا یہ رجحان ملتا ہے۔ اور ہر قوم نے تصوف کے اس رجحان کو حسب استعداد عملی شکل دی ہے ظاہر ہے، عام زندگی کی طرح باطنی زندگی کے متعلق بھی انسانوں کے ہر گروہ کا ردعمل اپنے اپنے قومی مزاج اور مخصوص ملکی و تاریخی حالات کے مطابق ہوتا ہے۔ اب اسلامی تصوف نے سب سے پہلے عربی ماحول کے اثرات لئے اور کتاب و سنت کو اس نے اپنا اساس بنایا۔ اس کے بعد آریائی تصورات و رجحانات سے سابقہ پڑا۔ اور اس نے ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مذہب،

ترکیب و ائتلاف اور ہم آہنگی و موافقت کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور تصوفِ اسلام مختلف ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا ایک ایسی منزل پر پہنچا کہ وہ دین و حکمت اور شریعت و طریقت دونوں پر جامع سمجھا جانے لگا۔

علامہ اقبال مرحوم تصوفِ اسلام کی اس جامعیت کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب "فلسفۂ عجم" میں لکھتے ہیں۔

> اسلامی تصوف کی قوت کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انسانی فطرت کے متعلق اس کا نقطۂ نظر بہت ہی جامع و مکمل ہے۔ اور اسی پر وہ مبنی بھی ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ راسخ العقیدہ مذہبی لوگوں کے ظلم و تعدی اور سیاسی انقلابات سے صحیح و سلامت آیا۔ کیونکہ یہ فطرت انسانی کے تمام پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے۔

تصوف کے اس دور میں جسے شاہ ولی اللہ صاحب اس کا پہلا دور کہتے ہیں "کوئی شخص نہ بے ہوش ہوتا اور نہ اسے وجد آتا، نہ وہ جوش میں آکر کپڑے پھاڑنے لگتا، اور نہ شطح یعنی خلاف شرع کوئی بات اس کی زبان سے نکلتی۔ یہ بزرگ محض خدا کا حکم سمجھ کر شرعی احکام ادا نہ کرتے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین ہوتی تھی۔ بات یہ ہے کہ وہ نفسی کیفیات جن کا نتیجہ کرامات و خوارق اور سرمستی و بے خودی کی قبیل کی چیزیں ہوتی ہیں، یہ کیفیات ان بزرگوں کے اندر اتنی راسخ نہ ہوئی تھیں کہ وہ ملکہ بن جاتیں۔ چنانچہ اس ضمن میں جب کبھی ان سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی تو یا تو اس کی صورت یہ تھی کہ وہ جس چیز کو از روئے ایمان صمیم قلب سے مانتے تھے وہ چیز بے اختیار ان کی زبان پر آجاتی .... یا یہ ہوتا کہ یہ بزرگ خواب میں بعض چیزوں کو دیکھ لیتے یا فراست سے نامعلوم چیز کو معلوم کر لیتے۔ لیکن یہ چیزیں ایسی نہ ہوتیں کہ عوام کی ان تک رسائی نہ ہو سکتی۔" (ہمعات)

غرض حضرت شاہ صاحب کے الفاظ میں "اس دور میں جسے تصوف یا احسان" کا پہلا دور کہنا چاہیئے اہل کمال کا غالب طور پر یہی حال رہا"

پہلی صدی ہجری کے بعد اہل کمال کے ایک گروہ میں یہ رجحان پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ احکامِ شریعت کی پوری پابندی کے ساتھ ساتھ باطنی زندگی کی نشو و نما میں لگ جاتے ہیں۔ ان بزرگوں میں

حضرت رابعہ بصری خاص طور پر ممتاز ہیں۔

علامہ اقبال تصوف کے اس رجحان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"اس کی نوعیت زیادہ تر سامی تھی۔ اس مکتب کے صوفیاء کے نصب العین میں طلب علم غالب نہیں ہے، بلکہ تقدس، دنیا سے بے تعلقی اور خدا سے گہری محبت جو گناہ کے شعور سے پیدا ہوتی ہے، ان کی زندگی کے مخصوص خط و خال میں سے تھی۔"

ان کے تقریباً ایک سو سال بعد تیسری ہجری کے اوائل میں ذوالنون مصری، بایزید بسطامی، اور جنید بغدادی کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ حضرت جنید کو موجودہ علم تصوف کا ایک لحاظ سے بانی سمجھنا چاہیئے۔ آپ کا رجحان شرعی پابندی کی طرف زیادہ تھا چنانچہ حضرت جنید کا یہ قول مشہور خاص و عام ہے کہ ہمارا "تصوف کتاب و سنت کے ساتھ موید ہے" آپ کی وفات ۲۹۷ھ میں ہوئی اور آپ کو سید الطائفہ کا نام دیا گیا۔

شاہ ولی اللہ صاحب تصوف کے اس دور کے بارے میں فرماتے ہیں:۔ "حضرت جنید جو گروہ صوفیاء کے سرخیل ہیں، ان کے زمانے میں یا ان سے کچھ پہلے تصوف کے ایک اور رنگ کا ظہور ہوتا ہے، اس زمانے میں یہ ہوا کہ اہل کمال میں سے عام طبقہ تو اسی طریقے پر کاربند رہا، جس کا ذکر پہلے دور کے ضمن میں ہو چکا ہے، لیکن ان میں سے جو خواص تھے، انہوں نے بڑی بڑی ریاضتیں کیں۔ دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ اور مستقل طور پر وہ ذکر و فکر میں لگ گئے۔ اس سے ان کے اندر ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی اس کیفیت سے مقصود یہ تھا کہ دل کو "تعلق باللہ" کی نسبت حاصل ہو جائے" "تعلق باللہ" کی اس نسبت کے حصول کے لئے" وہ مدتوں مراقبہ کرتے، اور ان سے تجلی، استتار انس اور وحشت کے احوال و کوائف ظاہر ہوتے، اور وہ اپنے ان احوال کو نکات و اشارات میں بیان بھی کرتے۔ ان اہل کمال میں سے سب سے صادق وہ بزرگ تھے، جنہوں نے اپنی زبان سے وہی کہا جو خود ان پر گزرا تھا۔"

حضرت شاہ صاحب کے الفاظ میں ان بزرگوں کی کیفیت یہ تھی:۔ "یہ لوگ سماع سنتے، مستی و بے خودی میں بے ہوش ہو جاتے۔ کپڑے پھاڑتے، اور وفور جوش میں رقص کرتے۔ یہ کشف و اشراف

کے ذریعہ دوسروں کے دلوں کی باتوں کو بھی معلوم کر لیتے تھے انھوں نے دنیا سے اپنا رشتہ توڑ کر پہاڑوں اور صحراؤں میں پناہ لی۔ اور گھاس اور پتوں پر زندگی گزارنے اور گودڑیاں پہننے لگے۔ نفس و شیطان کے مکروں اور دنیا کے فریبوں کو یہ خوب سمجھتے تھے اور ان سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے یہ لوگ مجاہدے بھی کرتے تھے الغرض اس دور کے اہل کمال کا تصوف یہ تھا کہ وہ خدا کی عبادت دوزخ کے عذاب سے ڈر کر یا جنت کی نعمتوں کے طمع میں نہ کرتے تھے، بلکہ ان کی عبادت کا محرک خدا کے ساتھ ان کی محبت کا جذبہ ہوتا۔"

تصوف کے اس دور میں توجہ[1] کی نسبت اپنے درجہ کمال تک نہ پہنچی تھی۔ اس زمانے میں ان اہل کمال میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا، جس نے کہ خاص توجہ کو ان معنوں میں اپنا نصب العین بنایا ہو کہ وہ ہمیشہ اسی کی بات کرتا اور اسی طرف اس کا ہر اشارہ ہوتا۔

حضرت جنید بغدادی سے منصور حلاج کا رشتہ مریدی بتایا جاتا ہے۔ منصور کا نعرہ "انا الحق" آگے چل کر صوفیہ کے ایک گروہ کے کارواں کے لئے بانگ درا بن گیا۔ منصور کو کم و بیش ۳۰۹ھ میں پھانسی دی دی گئی۔ اس تاریخی واقعہ کے بعد ایک سو سال کے اندر تصوف پر بعض مستقل کتابیں لکھی گئیں، جن میں ابونصر سراج[2] کی تصنیف "کتاب اللمع" ابو طالب مکی کی "قوت القلوب" القشیری کا الرسالہ اور حضرت داتا گنج بخش[3] کی کشف المحجوب خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اسی زمانے میں شیخ ابو سعید بن ابی الخیر اور ابوالحسن خرقانی ہوئے۔ جن سے شاہ ولی اللہ تصوف کے تیسرے دور کی ابتدا کرتے ہیں شیخ ابو سعید ۳۵۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۴۴۰ھ میں آپ نے وفات پائی۔

اس سلسلے میں شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔ سلطان الطریقت شیخ ابو سعید بن ابی الخیر اور شیخ ابوالحسن خرقانی کے زمانے میں طریق تصوف میں ایک اور تغیر رونما ہوا۔ اس دور میں اہل کمال میں سے

---

[1] "توجہ" سے یہاں مراد نفس کا پوری طرح حقیقت الحقائق یعنی ذات خداوندی کی طرف متوجہ ہونا ہے اور اس طرح کہ نفس اللہ کے رنگ میں کلیتہً رنگا جائے اور وہ دنیا کی عارضی اور فانی چیزوں پر پوری طرح غالب آجائے (ہمعات)

[2] آپ طوس کے رہنے والے تھے۔ ۳۷۸ھ میں آپ نے انتقال فرمایا۔

[3] سن وفات ۴۶۵ھ

عوام تو حسبِ سابق شرعی اوامر و اعمال پر ٹھہرے رہے اور خواص نے باطنی احوال و کیفیات کو اپنا نصب العین بنایا اور جو خواص الخواص تھے، انہوں نے اعمال و احوال سے گزر کر "جذب" تک رسائی حاصل کی۔ اس "جذب" کی وجہ سے ان کے سامنے "توجہ" کی نسبت کا راستہ کھل گیا۔ اس سے تعینات کے سب پردے ان کے لئے چاک ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی ایک ذات ہے جس پر تمام اشیاء کے وجود کا انحصار ہے وہی ذات سب اشیاء کی قیوم ہے۔ یہ لوگ اس ذات میں گم ہو گئے اور اس کے رنگ میں ان کے نفوس رنگے گئے چنانچہ اس حال میں نہ ان کو اوراد و وظائف کی چنداں ضرورت رہی اور نہ مجاہدے اور ریاضتیں کرنے اور نفس اور دنیا کے فریبوں کو جاننے کی سدھ بدھ رہی۔ ان کی تمام کوشش کا مقصد یہ ٹھہرا کہ جس طرح بھی ہو "توجہ" کی نسبت کی تکمیل کریں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں :- اس عہد میں توحیدِ وجودی اور توحیدِ شہودی میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ درحقیقت ان بزرگوں کی اصل غایت یہ تھی کہ ذات الٰہی میں اپنے وجود کو گم کر کے اس مقام کی کیفیات سے لذت اندوز ہوں۔ چنانچہ وہ اس بحث میں نہیں پڑتے تھے کہ کائنات کا وجودِ الٰہی سے کیا علاقہ ہے؟ انسان خدا کی ذات میں کیسے گم ہوتا ہے؟ اور فنا و بقا کے کیا حقائق ہیں؟"

جس زمانے میں شیخ ابو سعید کا انتقال ہوتا ہے، کم و بیش یہ وہی زمانہ ہے، جس میں امام غزالی[1]

---

[1] امام غزالی ۴۵۰ھ میں طوس میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام محمد بن محمد بن محمد بن احمد ہے آپ کا فقہ، کلام، اصول اور منطق میں بہت بڑا مقام تھا، اور اس کے ساتھ حکمت و فلسفہ پر بھی آپ کو بڑا عبور تھا۔ لیکن آخر میں آپ نے تصوف کی راہ اختیار کی اور اس کے تحت دین اور عقل کو ہم آہنگ کیا۔ بقول مولانا شبلیؒ آج تمام دنیا میں الہیات، نبوت اور معاد کے متعلق مسلمانوں کے جو معتقدات و مسلمات ہیں وہی ہیں، جو امام صاحب کے مقرر کردہ ہیں۔ جس قدر مشہور تصنیفات ہیں، امام صاحب کے ہی عقائد کے گویا شروح و حاشیے ہیں۔ حضرات صوفیہ اور علمائے اسلام سرتاپا اسی الہیات کے پیرو ہیں جس کو امام غزالی نے اسرارِ شریعت سے تعبیر کیا ہے، اور جس کی نسبت ان کو نہایت اصرار ہے کہ عام نہ ہونے پائے۔ حضرات صوفیہ اور فلاسفہ اسلام کے سرگروہ مولانا روم، شیخ الاشراق، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب ہیں، ان بزرگوں کی تصنیفات درحقیقت امام صاحب ہی کے (باقی صفحہ ۶۳ پر)

پیدا ہوتے ہیں، تصوف کی تاریخ میں امام غزالی کا شمار گروہ صوفیہ میں سے نہیں ہوتا، بے شک وہ عالم دین اور متکلم پہلے تھے۔ اور صوفی بعد میں، لیکن تصوف کے سلسلے میں ان کی خدمات یہ ہیں کہ اہل دین جو تصوف کی آزاد خیالی اور آزادروی سے بیزار ہو رہے تھے، اور تصوف جو شرعی قیود سے آزاد ہوتا جا رہا تھا آپ نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کیا۔ عقل جو اسلام میں تحریک معتزلہ کے نام سے مذہبی حقائق کی شارح بن کر نکلی تھی، ادھر ادھر بھٹک کر آخر کار امام غزالی کی شخصیت میں تصوف کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرتی ہے۔ اور اس طرح امام غزالی کی کوششوں سے ہمارا تصوف مذہب کی مسلمہ روایات سے ہمنوا ہوتا ہے۔ امام غزالی کا انتقال ۵۰۵ھ میں ہوا۔

حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی جن سے تصوف کا مشہور و معروف طریقہ قادریہ چلا، امام غزالی سے تقریباً ۵۵ سال بعد فوت ہوئے۔ ان کی تاریخ وفات ۵۶۱ھ ۱۱۶۶ء ہے طریقہ سہروردی کے موسس شیخ شہاب الدین سہروردی متوفی ۶۳۲ھ کے چچا اور ان کے مرشد شیخ ابو نجیب عبدالقاہر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے معاصر تھے۔ اور انہوں نے امام غزالی کے بھائی احمد غزالی سے اکتساب فیض کیا تھا۔ غرض امام غزالی ہی کے بعد تصوف کے مشہور خانوادے وجود میں آئے، جن کا سلسلۂ فیض اب تک جاری ہے۔

امام غزالی نے ۵۰۵ھ میں وفات پائی ان کے تقریباً پچاس برس بعد علم تصوف کے مشہور و معروف مصنف شیخ اکبر محی الدین ابن عربی پیدا ہوئے۔ ان سے شاہ صاحب تصوف کے چوتھے دور کا آغاز کرتے ہیں، اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

" آخر میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ان سے کچھ پہلے کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد میں ان اہل کمال بزرگوں کے ذہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ لوگ کیفیات و احوال کی منزل سے آگے بڑھ کر حقائق کی بحث و تدقیق کرتے ہیں۔ ذات واجب الوجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی

(بقیہ حاشیہ) خیالات کا نمونہ ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ علامہ صدرالدین شیرازی باوجود اختلاف مذہب کے الٰہیات میں امام غزالی کے خوشہ چین ہیں اور سند کے طور پر امام صاحب کی عبارت کے صفحے کے صفحے نقل کرتے جاتے ہیں (الغزالی)

ان بزرگوں نے ظہورِ وجود کے مدارج اور تنزلات دریافت کئے اور اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے سب سے پہلے کس چیز کا صدور ہوا۔ اور کس طرح یہ صدور عمل میں آیا۔ غرض یہ اور اس طرح کے دوسرے مسائل ان لوگوں کے لئے موضوعِ بحث بن گئے۔

ابن عربی نے تو ان حقائق کو علم و حکمت کی مغلق زبان میں پیش کیا۔ ان کے بعد عطار، رومی، جامی اور دوسرے شعراء شعر کے دل کش، وجد آور اور زود اثر پیرائے میں ان حقائق کو ادا فرمایا۔ اور اس طرح تصوف کے معارف خواص سے عوام تک پہنچے اور ہر شخص تصوف کا کلمہ پڑھنے لگا۔ ابن عربی مسلمانوں میں عقیدہ وحدۃ الوجود[۱] کے سب سے سرگرم مبلغ تھے، اور انہوں ہی نے اس عقیدے کو علمی طور پر تصوف کا اساس بنایا۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی وفات ۶۳۶ ھ میں ہوئی۔ اگرچہ شروع سے ان کی شخصیت اہل تصوف اور اہل شرع کے ہاں ما بہ النزاع رہی ہے، اور امام ابن تیمیہؒ اور بعض دوسرے بزرگوں نے ان کی تکفیر کی ہے، لیکن اس کے باوجود شیخ ابن عربی کے کمال پر اساطین امت کی شہادت[۲] ہے۔ مثال کے طور سے شیخ مجد الدین فیروز آبادی صاحب قاموس کہتے تھے۔ ہم کو قوم میں سے کسی کے متعلق یہ روایت نہیں پہنچی کہ کوئی شخص کبھی علم شریعت و حقیقت میں اس درجہ کو پہنچا ہو، جس درجہ کو شیخ محی الدین پہنچے ہیں۔ اور وہ شیخ کے غایت درجہ کے معتقد تھے۔ اور جو شخص شیخ پر نکیر رکھتا تھا، وہ اس پر نکیر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیشہ سے لوگ شیخ کے ساتھ عقیدت رکھنے پر اور ان مولفوں کو آب زر

---

[۱] سراحمد حسین "فلسفہ فقرا" میں لکھتے ہیں:- ابن عربی نے علم کے ذریعہ حقیقت کی گتھی کو سلجھانا چاہا تھا چونکہ علم کثرت کو ہمیشہ وحدت کے ذیل میں جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے قدرتی طور پر ابن عربی اس نتیجے پر پہنچے کہ مظاہر کی بوقلمونی ایک ہی وجود کا حاصل ہے اور ان سب کی اصل ایک ہی وجود ہے۔ یہی ہے ہمہ اوست یا وحدت الوجود کا تصور توحید۔

[۲] ابن عربی اور مولانا اشرف علی تھانوی

سے لکھنے پر غایت درجہ متوجہ رہے، ان کی حیات میں بھی اور ان کی وفات کے بعد بھی۔ اور اسی سلسلہ میں یہ بھی کہا کہ جس امر کا میں قائل ہوں اور اس کو محقق سمجھتا ہوں، اور اس کے موافق اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ رکھتا ہوں وہ یہ ہے کہ شیخ محی الدین، شیخ طریقہ تھے، حالاً بھی اور علماً بھی اور امام اہل تحقیق تھے، حقیقتاً بھی اور ظاہراً بھی اور علوم عارفین کے احیاء کرنے والے تھے فعلاً اور لفظاً بھی، اسی طرح کا بہت طویل مضمون فرمایا اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ حاصل کلام یہ ہے کہ شیخ پر بعض ایسے فقہاء خشک نے نکیر کیا ہے جن کو محققین کے مشرب سے کچھ بہرہ نہ تھا، باقی جمہور علماء اور صوفیاء نے تو اس کا اقرار کیا ہے کہ وہ اہل تحقیق و توحید کے امام ہیں اور علوم ظاہرہ میں یکتا و یگانہ ہیں[۱]

اور منجملہ ان کے ثنا خوانوں کے شیخ قطب الدین شیرازی ہیں اور وہ کہا کرتے تھے۔ شیخ محی الدین علوم شریعت و حقیقت میں کامل تھے، اور ان کی شان میں وہی شخص جرح و قدح کرتا ہے، جو ان کے کلام کو نہیں سمجھتا اور اسی لئے) اس کی تصدیق نہیں کرتا (مگر یہ ان کے کمال میں قادح نہیں) جیسا حضرات انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ایمان نہ لانے والوں کی زبان سے ان کو جنون و سحر کی طرف منسوب کیا جانا ان حضرات کے کمال میں قادح نہیں۔"[۲]

اسی طرح شیخ مؤیدالدین جخندی فرماتے تھے کہ ہم نے کسی شخص کو اہل طریق میں سے نہیں سنا کہ وہ ان علوم پر مطلع ہوا ہو، جن پر شیخ محی الدین مطلع ہوئے ہیں اور اسی طرح شہاب الدین سہروردی فرماتے تھے...... اور اسی طرح شیخ کمال الدین کاشی فرماتے تھے اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ شیخ محی الدین کامل محقق صاحب کمالات و کرامات ہیں ...... اور شیخ فخرالدین رازی نے بھی ان کی ثنا کی ہے اور کہا ہے کہ شیخ محی الدین ولی عظیم تھے ..."[۳]

غرض تاریخ تصوف میں شیخ محی الدین ابن عربی کا بہت بلند مقام ہے، اور ان کے افکار نے تصوف و معرفت کی دنیا میں شاید سب سے گہرے اور سب سے وسیع تر اثرات چھوڑے ہیں، چنانچہ مولانا

---

۱ ابن عربی از مولانا اشرف علی تھانویؒ

۲ " " " "

۳ " " " "

اشرف علی تھانویؒ آپ کے بارے میں فرماتے ہیں :- ....." میرا مسلک حضرت شیخ قدس اللہ سرہ کے باب میں یہ ہے کہ بنا بر شہادت جم غفیر اکابر امت کے جس کی حجیت حدیث انتم شہداء اللہ فی الارض سے ثابت ہے، شیخ کی مقبولیت اور ولایت کا عقیدہ کامل رکھتا ہوں ....." [1] نیز "..... اپنے بزرگوں کو چونکہ مثل دیگر ائمہ طریق کے ان کا معتقد پایا، ان کی عقیدت و عظمت ہمیشہ قلب میں مرکوز رہی ......" [2]

تصوف کے ارتقاء کے یہ چار دور ہیں، "ہمعات" میں ان کا ذکر کرنے کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں۔

" تصوف کے ان چاروں دوروں میں جو بھی اہل کمال بزرگ گزرے ہیں، گو وہ اپنے ظاہری اعمال و احوال میں الگ الگ نظر آتے ہیں، لیکن جہاں تک ان کی اصل کا تعلق ہے، میرے نزدیک وہ سب ایک ہیں۔ ...... تصوف کے یہ چاروں طریقے خدا تعالےٰ کے نزدیک مقبول ہیں اور ملاء اعلیٰ میں بھی ان سب کی منزلت مسلم ہے۔ ارباب تصوف پر بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ان بزرگوں کے ہر طبقے کے اقوال و احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے۔ اس سلسلے میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے ارباب تصوف کے اقوال اور احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے ناپتے پھریں۔"

---

[1] ابن عربی از مولانا اشرف علی تھانوی

[2] " " " "